Attribution-NonCommercial 4.0 International (CC BY-NC 4.0)
DOI No. www.doi.org/10.57156/bazyaft25478491

پنجاب میں متصوفانہ اُردو ادب کی روایت کا تاریخی جائزہ

ڈاکٹر یاسر ذی شان مغل
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، گورنمنٹ جناح اسلامیہ گریجوایٹ کالج، سیال کوٹ

The Sufi Poetic Tradition of Punjab: Historical Analysis

Dr. Yasir Zeeshan Mughal
Assistant Professor, Department of Urdu, Government Jinnah Islamia College, Sialkot

ABSTRACT:

From four and a half thousand years ago to the present day, Punjab has a unique model in the subcontinent in terms of cultural, social, linguistic, cultural and social diversity. Punjab is also the center of India in the Muslim era. Thanks to its residential centralism, Punjab has gained a prominent position in the region in terms of social, cultural, linguistic, political and social aspects. Urdu has a high-flying place among the spoken languages. Is a symbol of Punjabi Sufis of the sixteenth to nineteenth centuries played an important role in promoting this common civilization and culture. In their communications, these creators also taught great virtues such as unity, brotherhood, brotherhood, compassionate humanity, also taught strong ideological ideas while opposing. Chishti Sofia has been prominent in this process, who discovered the hidden relationship between the creator and the creatures through symbolic expression and also linked the Urdu language with the culture of the Punjab. Linguists also say that the original birthplace of Urdu is Punjab and it is here that the most prominent contribution in the promotion and development of this young language has been made by the Sufi writers of Punjab.

Key words: Sufi Urdu Poetry, Chishti Sufis, Punjab

زمانہ قبل مسیح سے اطراف واکناف عالم میں مشہور خطہ پنجاب جغرافیائی اعتبار سے برصغیر پاک وہند کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ پنجاب کی شمالی حدود کوہ ہمالیہ اور جنوبی حدود راجپوتانہ کے ریگستان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے مشرق میں بالائی وادی گنگا اور مغرب میں دریائے سندھ واقع ہے۔ پنجاب کا لفظ ابن بطوطہ کی تحریروں میں بھی ملتا ہے جو اُس نے ۱۴ویں صدی عیسوی میں اس علاقے کا دورہ کرتے ہوئے لکھیں، اس کا وسیع پیمانے پر استعمال سولہویں صدی کے دوسرے حصے کی کتاب تاریخ شیر شاہ سوری میں ملتا ہے، جس میں پنجاب کے شیر خان کے قلعے کی تعمیر کے حوالے سے ذکر ہے۔ آئین اکبری میں ابو الفضل نے پنجاب کو پنجند لکھا ہے۔ مغل بادشاہ جہاں گیر نے تزک جہاں گیری میں پنجاب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ سب نام اس تہذیب کی قدامت پر دلال ہیں۔ قدیم دور سے اب تک سرزمین پنجاب کو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا رہا کبھی ثَتَ گو، کبھی سپت سندھو تو کبھی پنج دوآب۔(۱) مختلف ادوار میں اس خطے کا نام تبدیل ہو کر اب ''پنجاب'' کا اسم اختیار کر چکا ہے جو کہ فارسی زبان کے دو لفظوں ''پنج'' اور ''آب'' کا مرکب ہے اس کا مطلب ہے پانچ پانیوں کی دھرتی۔ یہ نام پنجاب یہاں بہتے ہوئے پانچ دریائوں بیاس، راوی، ستلج چناب اور جہلم کی وجہ سے پڑا۔ پروفیسر ناشر نقوی لکھتے ہیں کہ:

> ''اِس دھرتی کو خدا نے پانچ دریاؤں کی نعمتوں سے سرفراز کیا اور اِن دریاؤں کو اس قدر سیراب رکھا کہ حرص وہوس کی پیاس ان کے قریب سے بھی نہ گزر سکی۔'' (۲)

جغرافیائی حوالے سے پنجاب کے انتہائی اہم ہونے کی ایک وجہ سرسبز وشاداب خطہ ہونا اور دوسری وجہ ڈیورنڈ لائن سے سرحدی علاقہ ہونا ہے کہ پنجاب کابل سے دہلی کو ملانے والی شاہ راہ (جرنیلی سڑک) پر واقع ہے اور اس شاہ راہ کے آس پاس بسنے والے شہروں (جہلم، اٹک، گجرات) کو شہرت بھی اسی وجہ سے ملی۔(۳) تجارتی و زرعی اعتبار سے پنجاب سونے کا خطہ کہلاتا ہے۔ پنجاب کے جنوب مشرق میں دریائے ستلج، شمال مغرب میں دریائے سندھ، شمال میں کوہِ کشمیر، کوہِ جموں، شمال مشرق میں کوہِ گانگڑہ اس سرزمین کے حسن کو زیبائی عطا کر رہے ہیں۔(۴) پنجاب کی قدامت کو مورخین نے سات آٹھ ہزار سال قبل کی دراوڑ نسل اور بعد ازاں آریاؤں کی اس علاقے پر یورش سے یہاں آباد ہونے والی نسل سے منسوب بتایا ہے۔ اس کے بعد ۵۰۷ق م میں ایران کے فرماں روا فریدون کے عہد سے پنجاب کا ایک بہت بڑا حصہ ایرانیوں کے زیر نگیں بھی رہا جو سکندر اعظم کی فتوحات تک انہی کے زیر اثر رہا اور اس کے بعد ریاستوں میں بٹ گیا۔(۵)

محققین کے مطابق ساڑھے چار ہزار برس قبل آریہ وسطی یورپ سے نکلے اور پنجاب میں وارد ہوئے۔ جس سے یہاں ایک نئے تہذیبی و معاشرتی تمدن کا آغاز ہوا جس میں لسانی عوامل نے نمایاں حیثیت اختیار کر لی کیوں کہ یہاں کے تہذیبی، تمدنی معاشرتی انقلابات نے ثقافتی اور معاشرتی تنوع کے زیر اثر لسانی عوامل کو تحریک دی۔ قدیم دور سے ہی ہڑپائی تہذیب کی مہروں کی عبارتیں یہاں کے قدیم ترین رسم الخط کا نمونہ ہیں۔ پنجاب کے میدانوں میں مقیم آریاؤں کی ویدک بھاشا سے سنس کرت نے جنم لیا جس سے دنیا میں سب سے پہلی مذہبی کتاب رگ وید تصنیف ہوئی۔ دنیا کی پہلی طویل ترین رزمیہ نظم رامائن بھی سب سے پہلے پنجاب ہی میں پڑھی گئی جب راجہ پریکشت کے بیٹے جنمے جیہ (Janame jaya) نے جب ناگا قبائل کو زیر کر کے گھوڑے کی قربانی (اشومیدیگیہ) کا جشن ٹیکسلا میں منعقد کیا تو کوی ویاس نے اس جشن میں اسے پڑھ کر سنایا تھا۔ معلومہ دستاویزی شہادتوں کے لحاظ سے دنیا میں پائی جانے والی سب سے قدیم گرامر اشٹ دھیائے (سنسکرت زبان کے قواعد وضوابط پر مبنی) کو اسی سرزمین پر ٹیکسلا کے تعلیمی مرکز کے ذہین اور فطین عالم اور استاد پانینی نے مرتب کیا۔ کوٹلیہ چانکیہ نے اپنی شہر آفاق کتاب ارتھ شاستر کی تصنیف کا آغاز بھی ٹیکسلا ہی میں کیا تھا۔ سنس کرت زبان سے پیدا ہونے والی پالی زبان کی جنم بھومی بھی یہی سرزمین ہے۔ آرامی اور یونانی رسم الخط بھی ابتدا میں پنجاب کے علاقے میں رائج ہوئے تھے۔ حمید اللہ ہاشمی پنجاب میں لسانیات کے عمل کے آغاز کو انسان کے یہاں آباد ہونے سے جوڑتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ

> ''پنجابی زبان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا پنجاب میں خود انسان کا وجود۔(۶) اس زبان کے مختلف لہجے اور مختلف نام رائج رہے اور پنجابی زبان نے مختلف تہذیبوں کا سفر طے کیا۔ موجودہ پنجابی پر عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے اثرات بھی رہے۔''(۷)

تاریخ کا مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے کہ اسلامی دور کے آغاز کے ساتھ ہی مسلمانوں کی شمال مغرب سے آمد و رفت کے ساتھ پنجاب میں جدید فارسی کا چلن شروع ہو گیا۔ عرب دور میں ملتان شہر میں فارسی کی موجودگی معتبر علمی حوالوں سے ثابت ہے۔ اکتساب کا دائرہ کم ہو یا زیادہ بہر طور مسلمانوں کی تمام موجودہ علاقائی اور قومی زبانیں ؛ملی اسلامی زبانوں یعنی عربی اور فارسی سے یا تو براہ راست ماخوذ ہیں یا بالواسطہ ان سے فیض یاب ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ عربی قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر، تاریخ و اسماء الرجال، فلسفہ و علم الکلام اور خاصی حد تک علم و ادب کی زبان تھی اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام، محدثین و مفسرین، مورخین و متکلمین، علما و فضلا اور آئمہ اکرام نے چھے سات صدیوں تک ذریعہ اظہار کے طور پر استعمال کیا دوسری زبان فارسی علم و ادب، حکومت و حکمت

اور فن و شاعری کی زبان تھی اور اسے علما و فضلا، حکما و عمال اور مورخین و شعراء نے کم و بیش انیسویں صدی تک ذریعہ اظہار بنائے رکھا۔ ان زبانوں کے طویل غلبے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی علاقائی اور قومی زبانیں ان سے اب تک متاثر ہیں۔ پنجاب میں عمومی اثرات کے علاوہ عربی اور فارسی کے خصوصی اثرات بھی تاریخ ادب کا نقش اول ہیں۔ غزنوی عہد سے مغل عہد تک پنجاب بالخصوص لاہور میں فارسی زبان میں بہت کثرت سے شعر و ادب تخلیق ہوا۔ محققین کے مطابق برصغیر میں فارسی زبان کے دو اولین دیوان یعنی دیوان مسعود سعد سلمان اور دیوان ابوالفرج رونیلا ہور میں ہی لفظ پوش ہوئے۔ سید ابوالحسن علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف پر برصغیر کی اولین کتاب کشف المحجوب کو یہیں تصنیف کیا۔ فارسی شعراء کا اولین تذکرہ لباب الالباب بھی محمد عوفی نے اسی سرزمین پر سپردِ قلم کیا۔ فنِ حرب پر فارسی میں اولین کتاب آداب الحرب والشجاعت بھی پنجاب ہی میں منصہ شہود پر آئی۔ برصغیر میں ابتدائی دور کی دو مشہور تاریخی کتابیں تاج المآثر اور طبقات ناصری بھی سر زمین پنجاب کی تخلیق ہیں۔ چچ نامہ کی صورت میں برصغیر میں عربی سے فارسی کا پہلا ترجمہ بھی پنجاب ہی میں ہوا تھا۔ اسماعیلی فرقے کی اولین عسکری اور فکری یلغار بھی پنجاب کے علاقہ ملتان پر ہوئی تھی۔ فلسفۂ وحدت الوجود کا تعارف بھی معروف فارسی شاعر فخر الدین عراقی کی بدولت سب سے پہلے ملتان میں ہوا تھا۔ راجپوتانہ میں جنم لینے والے ناتھ جوگیوں کے فرقے نے غزنوی عہد میں اپنی سرگرمیوں کے لیے پنجاب ہی کی سرزمین کو اپنا مرکز بنایا۔ سکھ مذہب کے بانی بابا گرو نانک صاحب بھی اسی سرزمین سے اُٹھے۔ سکھ دھرم کی ترویج و اشاعت بھی پنجاب کی سر زمین میں ہوئی۔ اورنگ زیب کے عہد میں ستنامیوں کے بانی جس کی تعلیمات کو پوتھی کہتے ہیں کا مولد بھی پنجاب ہی تھا۔ اسلامی تصوف کے اہم سلاسل طریقت چشتی، سہروردی، قادری اور نقشبندی کا آغاز بھی پنجاب ہی میں ہوا۔ عہدِ اسلامی میں لاہور، اوچ، ملتان اور سیال کوٹ جیسے شہر پنجاب میں تعلیمی خدمات کے لیے نمایاں حیثیت حاصل کر گئے یوں یہ سلسلہ لسانیاتی، معاشرتی اور ثقافتی امتزاج کا باعث بنتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں تشکیل پانے والی معاشرت قدیم عہد سے یعنی منڈا نسل، دراوڑ، کول، آریائوں، مسلمانوں، افغانوں، مغلوں اور آخر کار انگریزوں تک کی مختلف تہذیبوں کا حسین امتزاج لیے ہوئے اپنا عظیم الشان تہذیبی، ثقافتی اور لسانی گہوارہ تشکیل دیتی ہے۔ گویا یہ سرزمین تہذیبی، تمدنی گہوارہ ہے۔(۸)

اس طویل معاشرتی سفر کا علمی جائزہ لیتے ہوئے نام ور لسانی محقق حافظ محمود شیرانی نے اپنی تحقیق ''پنجاب میں اردو'' (مطبوعہ ۱۹۲۸) میں تاریخی عوامل، ٹھوس لسانی تجزیے اور داخلی شواہد کی بنا پر پنجاب کو اُردو کا

جنم گھر قرار دیا۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنے گہرے لسانی مطالعے اور ٹھوس تحقیقی بنیادوں پر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ اُردو کی ابتدا پنجاب میں اس وقت ہوئی جب سلطان محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری ہندوستان پر بار بار حملے کر رہے تھے۔ ان حملوں کے نتیجے میں فارسی بولنے والے مسلمانوں کی مستقل حکومت پنجاب میں قائم ہوئی اور دہلی کی حکومت کے قیام سے تقریباً دو سو سال تک یہ فاتحین یہاں قیام پذیر رہے۔ اسی طویل عرصے میں زبان کا بنیادی ڈھانچہ صورت پذیر ہوا، جس میں پنجابی، فارسی اور مقامی بولیوں کے اثرات سے ایک نئی زبان کی ابتدائی صورت نظر آتی ہے۔ ان کی اس نظریے کی تائید میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور دیگر ماہرین لسانیات نے اُردو کی اصل جائے پیدائش پنجاب کو مانا ہے۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ:

> ''اُردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوتی ہے۔''(۹)

اس ابتدائی عرصے میں صوفیہ کرام اور علمائے عظام کی علمی مساعی قابل تحسین ہیں جنہوں نے اُردو نثر کو مرتب و منظم کر کے اولین سرمائے سے مزین کیا۔ ان کاوشوں نے اُردو ادب میں نثر کو ہمہ گیریت اور آفاقیت سے ہم کنار کیا۔ بیسیوں اہل قلم نے نثر میں قلم کشائی کی اور بیسویں صدی کے آغاز تک اُردو کو علمی، ادبی اور تخلیقی اعتبار سے باثمر کیا اور مقدار و معیار ہر دو حوالوں سے اُردو زبان و ادب میں نئی جہتوں اور زاویوں کا اضافہ کرتے ہوئے اسے وسعت دی۔ ان سب میں نمایاں ترین نام حضرت بابا فرید گنج شکر کا ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر کے بارے میں مولوی عبدالحق اور حافظ محمود شیرانی نے یہ دعویٰ بڑے استدلالِ قوی کے ساتھ رقم کیا ہے کہ وہ اپنے وقت کے بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی زبان اس بولی سے مختلف ہے جو ملتان میں ڈھلی اور لاہور میں پہنچ کر ترقی کی منازل طے کر رہی تھی اور جو بابا فرید گنج شکر کے اپنے خاندان اور اہل و عیال کی زبان تھی۔ تاہم حضرت بابا فرید کی زبان میں ملتانی کے اثرات موجود ہیں۔ ان کی زبان دہلی میں بولی جانے والی کرت یا ریختہ سے کافی مشابہ ہے اس لیے کہ بابا فرید نے حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے شاگرد اور مرید کی حیثیت سے دہلی میں کافی دنوں تک قیام فرمایا تھا اور اس قیام کے سبب زبانِ ریختہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہوا اور اس میں نکھار بھی پیدا ہوا۔ سِکھ مذہب کی مقدس کتاب گرو گرنتھ صاحب میں سنت کبیر اور نام دیو کے علاوہ بابا فرید کا کلام بھی شامل ہے۔

بنارس کے رہنے والے اور ذات کے جولاہے کبیر بھگتی تحریک کے سب سے بڑے اور مشہور ترین شاعر ہیں جو توحید کے علم بردار اور بت پرستی کے شدید مخالف تھے۔ کبیر نے عوامی زبان، لب و لہجے، آہنگ اور ترنم کے

ساتھ آسان اور سلیس اسلوب میں اپنے نظریات کو دوہوں میں قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے عوامی زبان کو اسی انداز میں استعمال کیا جیسی وہ بولی جارہی تھی، فارسی، عربی اور پنجابی کے بیش تر الفاظ بھی ان کے دوہوں میں ملتے ہیں۔

کبیر کی فکر نے گرونانک کے فکر اور خیال کو جنم دیا جو رفتہ رفتہ ایک نئے مذہب کی شکل میں ڈھل گئے۔ بابا گرونانک صاحب (۱۴۶۹ء؛۱۵۳۸ء) نے کبیر کو اپنا پیشوا کہا ہے۔ ۱۴۹۶ء میں بابا گرونانک صاحب کی کبیر سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے، جن کا سالِ وفات وہی ہے جو بابا گرونانک صاحب کا ہے، اپنے خطوط میں بابا گرونانک صاحب کا ایک دوہا لکھا ہے:(۱۰)

موبو پیاس نانک لہو پانی　　پیو سو رانڈ سہاگن نانوں

بابا گرونانک صاحب نے بھی پنجاب میں اُردو شاعری کے فروغ میں اچھا خاصا حصہ لیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق بابا گرونانک صاحب کے کلام میں پنجابی کے ساتھ کھڑی بولی کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ گرو گرنتھ صاحب میں عربی، فارسی الفاظ بھی بہ کثرت موجود ہیں اور اس میں اُردو زبان کی جو شکل و صورت ملتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اُردو کے ساتھ پنجابی زبان کا سہارا بھی لیا ہے۔ گرو گرنتھ صاحب کا دوسرا قابل ذکر شاعر نام دیو ہے۔ نام دیو بنیادی طور پر مراٹھی کا شاعر تھا لیکن گرو گرنتھ صاحب میں اس کا جو کلام ملتا ہے وہ ہندوی یعنی اُردو اور پنجابی کے آہنگ میں مکمل طور سے ڈھلا ہوا ہے، کبیر، نام دیو اور بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری مشمولہ گرو گرنتھ صاحب کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ گورو گرنتھ صاحب میں پنجابی اُردو لسانی رشتوں کے عکس موجود ہیں۔ عباداللہ گیانی لکھتے ہیں کہ:

> ''گرو گرنتھ صاحب میں اُردو زبان کی جو شکل و صورت ملتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گرو صاحبان اور وہ شعراء جن کا کلام اِس میں شامل ہے نے اپنے خیالات کی تبلیغ کے لیے اس (پنجابی) زبان کا بھی سہارا لیا۔''(۱۱)

اُردو میں نثر ہو یا نظم بابا فرید کے علاوہ بھی صوفیۂ چشت کی ادبی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ اُردوئے قدیم کے ارتقاء کی کڑیاں سلسلہ چشتیہ کے بیشتر بزرگوں سے کڑیوں کی صورت جڑی نظر آتی ہیں۔ چراغ دہلی خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، شیخ حمید الدین ناگوریؒ، شیخ شرف الدین بو علی قلندرؒ، سلطان المشائخ حضرت شاہ نظام الدینؒ، حضرت امیر خسروؒ، شیخ علاء الدین الحق بنگالیؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، خواجہ اشرف جہانگیر سمنانیؒ، شیخ

عین الدین گنج العلمؒ، سید محمد عبد اللہ حسینیؒ، سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ، سید اکبر حسینیؒ، شاہ میراں جی شمس العشاقؒ، شاہ برہان الدین جانمؒ، شاہ امین الدین اعلیٰؒ، باباشاہ حسینی المعروف بہ پیر بادشاہؒ، شاہ میراں یعقوبؒ، شیخ بہاء الدین باجنؒ، شاہ علی محمد جیو گام دھنیؒ، شیخ خوب محمد چشتیؒ، شیخ جیونؒ، شیخ حسین چشتی صوفیؒ، خواجہ محمد چشتیؒ، مولانا محمد ابراہیم خوش دلؒ، شاہ عبد القادرؒ، عبدلؒ، لطفیؒ اور حسینیؒ جیسے عظیم نام شامل ہیں۔(۱۲)ادبی تحقیق سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان و ادب کا چراغ سرزمینِ پنجاب کے صوفیہ کرام کی آبیاری کا رہین منت ہے۔ مورخین نے مختلف تاریخی حوالوں سے اس بات کی سند پیش کی ہے کہ اُردو کا قدیم نام "ہندی" یا "ہندوی" ہے۔ صوفیہ اور عہد قدیم کے ادباء و شعرا کے ہاں بھی یہی نام استعمال ہوا جن کی شہادتوں کی بنا پر اُردو کی اصل اور قدیم کو "ہندی" یا "ہندوی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ غزنوی عہد سے لے کر مسعود سعد سلمان، امیر خسرو اور دیگر سلسلہ چشت کے بزرگ ادیبوں اور شعرا کے ہاں اس ضمن میں قوی دلائل مورخین نے پیش کیے۔

خواجہ نصیر الدینؒ(۶۵۶ھ)، شرف الدین یحییٰ منیریؒ(۷۷۶ھ)، اشرف جہانگیر سمنانیؒ وغیرہ کے ہاں ہندی یا ہندوی کا استعمال نظر آتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی جب لاہور کو(۴۱۳ھ) "محمود پور" کا نام دیتا ہے اور اپنا سکہ جاری کرتے ہوئے لاہور کو اپنے زیر نگیں کرتا ہے۔ تو اسی عہد میں اُردو زبان و ادب کی قدیم تاریخ بھی رقم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جس کا پہلا سپوت "مسعود سعد سلیمان" (۴۳۷ھ، ۵۱۵ھ / ۱۰۴۶ء-۱۱۲۱ء) پنجاب کی سرزمین کا نمائندہ ہے۔ جو اُردو زبان و ادب کا پہلا قلم کار شاعر ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری نے بھی اس بارے میں لکھا ہے:

> "مسعود نے تین دیوان مرتب کے، ان میں ایک ہندوی تھا۔ امیر خسرو نے بھی اپنے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں مسعود کے متعلق یہی لکھا ہے۔ مسعود لاہور کا باشندہ تھا اور جس وقت مسلمانوں نے دہلی فتح کی اس وقت بقید حیات تھا۔ اس طرح اس نے جو کچھ بھی لکھا ہو گا، یقیناً اسی زبان میں تھا جو پنجاب میں بولی جاتی تھی۔"(۱۳)

اسی عہد میں جب دارالسلطنت لاہور سے دہلی کو منتقل ہوتا ہے تو غوری حاکمان کے ساتھ پنجاب میں موجود زبان سرکاری، تجارتی، معاشرتی و دیگر امور کے لیے دلی پہنچ جاتی ہے۔(۱۴)اس طرح یہ زبان اپنا ارتقائی سفر جاری رکھتے ہوئے پنجاب سے دلی میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جب حکمران، فاتح، درباری اور لشکری دہلی میں ڈیرے جماتے ہیں تو ساتھ ہی دہلی کے گرد و نواح میں صوفیہ کرام کی کاوشیں بھی بڑھ جاتی ہیں اور صوفیہ کرام بڑی تیزی کے

ساتھ اس خطہ کے لوگوں کی اخلاقی تربیت، اصلاحی فریضہ کو عبادت سمجھ کر دعوت اسلام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ چوں کہ یہ طبقہ براہ راست عوام کے ساتھ رابطہ میں تھا اور حکمرانوں، درباروں اور لشکریوں کی طرح عوام سے دور نہیں تھا تو صوفیہ کرام اپنے اس مشن کے لیے جس زبان کا انتخاب کرتے ہیں وہ عوام کی زبان ہے۔ یہی زبان ہندی اور ہندوی ہے۔ جس میں اس عہد کے صوفیہ کرام نے زبان و ادب کے حوالے سے وہ تاریخی کام بھی کیے جو زبان وادب کے ارتقا میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ بعض محققین و مورخین اُردو زبان کا آغاز بھی انہی ہستیوں سے منسوب کرتے ہیں۔

مسعود سعد سلمان کے بعد امیر خسروؒ سے بھی ایک ہندی دیوان منسوب کیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے امیر خسروؒ کو ہندی اور اُردو کے اولین شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔ امیر خسروؒ نے غرۃ الکمال میں اپنے ہندوستانی پن اور ہندوی گوئی پر کچھ اس انداز فخر کا اظہار بھی کیا ہے:

"ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب شکر مصری ندارم گز عرب گویم سخن" (۱۵)

محمود شیرانی لکھتے ہیں:

"ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ خواجہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے مگر بد قسمتی سے ان کا کلام دستِ بردِ زمانہ کے ہاتھوں شاید ہمیشہ کے لیے برباد ہو گیا ہے"۔ (۱۶)

ڈاکٹر نظیر احمد بھی امیر خسروؒ کے کلام کی شہادت میں لکھتے ہیں:

'اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ (امیر خسرو) ہندی کے ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور انھوں نے اس زبان میں کافی سرمایہ بھی چھوڑا ہو گا۔ یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ خسرو کا ہندی کلام سارا برباد ہو گیا۔ دراصل اس کی بازیابی کی پوری کوشش نہیں ہوئی"۔ (۱۷)

لیکن بعد کی تحقیق نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ شمس القادری نے ڈاکٹر اشپرنگر کے حوالہ سے اپنی کتاب "اُردوئے قدیم" میں امیر خسروؒ کے ایک نسخہ کا ذکر کیا ہے جس کو اشپرنگر اپنے ۱۸۵۶ء میں اپنے وطن جرمنی لے گئے تھے۔ شمس القادری اس بارے میں لکھتے ہیں:

"شاہان اودھ کے کتب خانوں میں جو موتی محل اور توپ خانہ میں تھے، حضرت امیر خسروؒ کے دوسو چیستاں موجود تھے اور ان کے علاوہ ایک مجموعہ میں ان کا متفرق کلام جمع تھا، جس میں فارسی آمیز

غزلیں اور کہہ مکرنیاں وغیرہ تھیں۔ ان دونوں مجموعوں کو ڈاکٹر اشپرنگر نے دیکھا تھا اور ان کے متعلق ایک مضمون بھی لکھا تھا جو ۱۸۵۴ میں شائع ہوا تھا"۔ (۱۸)

یہی وہ نسخہ ہے، جو گوپی چند نارنگ کو ۱۹۸۲ میں سفر یورپ کے دوران برلن میں ہاتھ لگا۔ وہ لکھتے ہیں:

"غرض شاہان اودھ کے کتب خانوں میں امیر خسروؒ کے ہندوی کلام کے جو قلمی نسخے محفوظ تھے اوران میں جو دوسو پہیلیاں تھیں، ان میں سے ۱۵۰ کا نسخۂ برلن کی صورت میں مل جانا شاکقین خسروؒ کے لیے ایک نادر تحفہ ہے یا نہیں، لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس سے خسروؒ کے ہندوی کلام پر مزید غوروخوض اور تحقیق و تفتیش کا ایک نیا دریچہ ضرور وا ہو جاتا ہے"۔(۱۹)

امیر خسروؒ نے اپنے ہندوی کلام میں مختلف پیرایوں میں ہندوی الفاظ کو اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے۔ کلام پر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شاعری میں امیر خسروؒ کا طریقہ جداگانہ تھا۔ یعنی کبھی ایک مصرعہ فارسی اور دوسرا اُردو تو کبھی آدھا اُردو تو کبھی آدھا فارسی میں۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ دونوں مصرعے اُردو میں بنائے، جن میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کی گونج تھی۔(۲۰) یعنی امیر خسروؒ کبھی فارسی کی لڑیوں میں چند ہندی لفظوں کو جگہ دیتے ہیں تو کبھی فارسی مصرعوں میں اُردو مصرعہ ٹانکنا انھیں پسند ہے یا پھر کبھی کبھی فقط ہندی لفظوں سے ہی مکمل مصرعہ بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ خسرو کو ہندوی زبان پر قدرتِ بیان حاصل تھی اور امیر خسروؒ کے ہندوی کلام میں معیاری ہندوی کی نفاست پسندی ان کے کلام میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کا پتا دیتی ہے۔ شبلی نعمانی نے اس تبصرہ کرتے ہوئے امیر خسروؒ کے کلام کی نزاکتوں اور ادبی موشگافیوں پر ان کی مہارت اور قدرت بیان کی شہادت دی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اس بارے میں لکھتے ہیں :

"اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع، ایران وروم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کیے ہوں گے، صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی نظیری، بے شبہہ اقلیم سخن کے جم وکے، لیکن ان کی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے لیکن خسرو کی جہاں گیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، سب کچھ ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد اور صنایع وبدایع کا تو شمار نہیں"۔(۲۱)

امیر خسروؒ کے بعد تغلق کے عہد میں جب دارالحکومت دہلی سے دولت آباد منتقل ہوتا ہے تو ہندوی لکھنے پڑھنے والے لوگ دہلی سے دکن میں آباد ہوتے ہیں تو حالات زبان و ادب کے لیے اس قدر ساز گار ثابت ہوتے ہیں کہ اُردو زبان و ادب کے ارتقا میں وہ تیزی آجاتی ہے جو اس سے قبل دیکھنے کو نہیں ملتی۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

> ''تغلق کے عہد میں جب دلی سے دولت آباد کو دارالحکومت منتقل ہوتا ہے تو یہی زبان دلی سے دکن میں پہنچ جاتی ہے تو اس طرح گوجری، گجری، ریختہ جیسے ناموں سے بھی موسوم ہوتی رہی۔''(۲۲)

غیاث الدین تغلق پنجابی تھا۔ جو ایک بڑا لشکر لے کر پنجاب سے زبان کو دہلی اور اس کا فرزند تغلق دہلی سے دولت آباد دکن منتقل کرتا ہے۔ اس طرح پنجاب کے اثر و رسوخ کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دکن سے نثر اور نظم کے ابتدائی نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ اس عہد کی زبان و ادب کے حوالے سے کاوشوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> '' آٹھویں صدی ہجری سے اُردو نثر کے نمونے رسائل کی صورت میں سامنے آتے ہیں جو بالخصوص دکن و گجرات کے فقراء اہل دل اور صوفیاء کے اقوال و ملفوظات کی صورت میں اردو نثر کے اولین اور ابتدائی نمونوں میں شمار ہوتے ہیں۔'' (۲۳)

حافظ شیرانی نے آٹھویں صدی ہجری کے بعد دسویں صدی ہجری میں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کے ایک مصنف مولانا عبدیؒ کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ۱۰۷۴ھ میں فقہ ہندی کو تصنیف کیا۔ حافظ شیرانی کا خیال ہے کہ ان کی تصنیف میں جو اُردو مستعمل ہے وہ پنجابی نما اُردو ہے۔ حافظ شیرانی اس بارے لکھتے ہیں :

> ''پنجاب میں اُردو کا ایک نیا مرکز قائم ہوتا ہے۔ یہاں کے مصنفین میں سب سے مقدم مولانا عبدی ہیں جو ۱۰۷۴ھ میں بعہد عالم گیر فقہ ہندی تصنیف کرتے ہیں۔ فقہ ہندی کی اُردو بالکل پنجابی نما ہے اور جملوں کی بندش بھی پنجابی طرز کی ہے۔ '' (۲۴)

دسویں صدی ہجری کے بعد بارھویں صدی میں بٹالہ گورداسپور میں پنجاب کی اُردو کے حوالے ملتے ہیں۔ یہاں اُردو کی تحریک شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی نے پروان چڑھائی۔ ان کے فرزند شاہ غلام قادر (متوفی ۱۱۷۶ء) کی ایک اُردو مثنوی رمز العشق ملتی ہے۔ بارہویں صدی کے آخر میں پنجاب میں کئی ایسے بزرگ ہیں جو اُردو منظومات کو سپرد قلم کر رہے ہیں۔ شیخ محمد جان، شیخ نصیر الدین، محمد غوث بٹالوی، نام دار خان در، دل شاد پسر وری غلام قادر

جلال پوریہ اور رام کشن کے نام اس ضمن میں قابل کر ہیں۔ نظم کے ساتھ ساتھ یہاں نثری نمونے بھی موجود ہیں جیسے کتاب ''ہزار مسائل'' اور رسالہ ''سلوتری'' جن کے مصنفین کا سراغ تاحال نہیں ملا۔ (۲۵)

یہ وہ زمانہ ہے جب پنجاب میں اُردو کے تخلیقی ادب کا منظر نامہ بہت وسعت اختیار کر لیتا ہے۔ جب ہم پنجاب کو دبستانی اکائیوں میں تقسیم کر کے یہاں اُردو پنجابی تخلیقی ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو اس باغ میں بہار نظر آتی ہے۔ یہاں کے تخلیق کاروں کو ادب تخلیق کرنے کے لیے مشترکہ لسانی فضا مل جاتی ہے۔ اس مشترکہ لسانی فضا کے ملنے سے جو ادب تخلیق ہوا اس کی لفظیات ایک دوسرے میں رچ بس گئی ہیں۔ اس کے نتائج بعد کے زمانوں میں سامنے آئے جب اُردو پنجابی سانجھ سے جہاں لفظیات کا تبادلہ ہوا وہیں ان دونوں کے بہت سے الفاظ نے اپنے اپنے دائرے سے نکل کر ایک دوسرے کے دائرے میں مستقل جگہ بنالی اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

خورشید احمد خان نے پنجاب کے ان دبستانوں کا ذکر کیا ہے جہاں پر متصوفانہ فکر کے حامل تخلیق کاروں کی ایک بڑی تعداد ایک مخصوص مزاج اور رجحان کے ساتھ اُردو زبان و ادب کی ارتقائی منزلوں کو عبور کرنے میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔

دبستان بٹالہ: بٹالہ میں شیخ محمد افضل قادری کلانوری، نور العین واقف عاجز بٹالوی، غلام غوث بٹالوی، حیات قادری، شیخ محمد حاجی، سید غلام غوث بٹالوی، شیخ نصیر الحق، شیخ نور محمد، موسیٰ، شیخ محمد حاجی، محمد جان، علیم قادری اور سید محمد شاہ بٹالوی اُردو زبان و ادب کی خدمت میں محو سفر رہے۔

دبستان ملتان: ملتان ہمیشہ علم و اَدب کا گہوارہ رہا ہے۔ اہل ملتان کی زبان اگرچہ ملتانی تھی لیکن سرکاری زبان کے ناطے فارسی اُن کی دوسری زبان تھی ملتان کے علماء ادباء اور شعراء فارسی کو بھی وسیلۂ اِظہار بناتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کے بعض نادر نمونے ملتان ہی سے ملے ہیں اور بعض نادر کتب قلمی کتب قدیم گھرانوں کے ذاتی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس تناظر میں لسانیات کے بعض محققین ملتان کو اُردو کا ابتدائی مرکز قرار دیا ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش اِسی خطے سے بھی تلاش کیے گئے ہیں۔ ملتان کے اسی ورثے سے یہاں اُردو شاعری کے آغاز کار شتہ وابستہ ہوتا ہے۔ فارسی کا غلبہ ہونے کی وجہ سے ملتان میں فارسی زبان میں شعر کہنے والوں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی۔ بالخصوص تصوف کا گہوارہ ہونے کی وجہ سے اس زمانے کے ملتان کی فارسی شاعری میں تصوف کی بے پناہ چاشنی موجود ہے۔

یہ ادبی روایت آگے بڑھی اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ چل نکلا تو فکر و نظر میں بلندی اور وسعت پیدا ہوئی، زمانے کی ضرورت کے مطابق انقلابی اور آزادی کا آغاز ہوا تو تحریکوں کی بنا پر اُردو قومی شاعری کی بنیاد پڑی۔ یوں اُردو کی ترقی سے فارسیت کا غلبہ کم ہونے لگا۔ اس دور کے شاعروں میں ہندو، مسلمان سبھی شامل تھے، مسلمان شعرا میں سے اسد ملتانی اور کشفی ملتانی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

دبستان لاہور: پنڈت چندر بھان برہمن لاہوری، مولوی عبداللہ عبدی لاہوری شاہ عبدالحکیم لاہوری، حاجی لاہوری، رضالاہوری، قناعت لاہوری، حافظ احسن اللہ لاہوری، حسین چشتی لاہوری، اشرف نوشاہی، غوث ابن عظیم حیدر لاہوری، آدینہ بیگ کامل، فیض لاہوری اور احمد بخش یک دل لاہوری، پنجاب کی علمی ،ادبی سرگرمیوں میں اپنا حصہ ڈالتے رہے۔

دبستان ہریانہ: قطبی رہتکی، شاہ غلام جیلانی رہتکی، شاہ محمد رمضان مہمی اور غلام حسین مہمی وغیرہ دبستان ہریانہ سے وابستہ نام تھے۔

دبستان سرہند: بشیر احمد سرہندی، اویسی سرہندی، شائق سرہندی، مشتاق سرہندی، احمد سرہندی، شاہ نیاز سرہندی اور اختر سرہندی سرزمین سرہند سے دبستان پنجاب کو تقویت عطا کر رہے تھے۔

دبستان قصور: حافظ مرتضیٰ خویشگی قصوری، سید غلام محی الدین قصوری اور خلیفہ عارف قصوری وغیرہ کے نام دبستان قصور کی ادبی زرخیزی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔(۲۶)

علامہ اقبال نے بھی پنجاب کی اس علمی زرخیزی کو تلاش کرنے کی ضرورت پر توجہ دلائی۔ ان کے ۷ مئی ۱۹۲۵ء کے ایک مکتوب سے بھی پنجاب میں اُردو کی کاوشوں کی تحسین ہوتی ہے۔

> 'اُردو زبان اور لٹریچر کی تاریخ کے لیے جس قدر مسالہ ممکن ہو جمع کرنا ضروری ہے۔ غالباً پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالہ موجود ہے اگر اس کے جمع کرنے میں کسی کو کامیابی ہوگئی تو مورخ اُردو کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے"۔(۲۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے "تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں:

'اُردو کو اہل پنجاب ہی نے اپنے سینے سے دودھ پلا کر پالا پوسا اور بڑا کیا۔ اُردو کی روایت اور تاریخ میں پنجاب اسی طرح شامل ہے جس طرح انسانی رگوں کے اندر دوڑتے ہوئے تازہ خون میں سرخ اور سفید چشمے۔"(۲۸)

ڈاکٹر جمیل جالبی مزید لکھتے ہیں :

"پنجاب اور اہل پنجاب سے اس زبان کا رشتہ ناتا روز اوّل ہی سے قائم ہے اور اہل پنجاب نے شروع ہی سے اس زبان کو بنانے سنوارنے میں حصہ لیا ہے۔ وہ زبان جو عبوری دور میں دہلی سے دکنی، گجرات، مالوہ اور دسرے صوبوں میں پہنچی اس کی ساخت اس کے مزاج، لہجے اور آہنگ پر پنجاب ہی کا اثر سب سے زیادہ گہرا تھا۔ قدیم گجری و دکنی ادب کے نمونوں میں جب ہم پنجابی اثر و مزاج کو دیکھتے ہیں تو ذرا دیر کو حیرت ضرور کرتے ہیں۔ لیکن ہماری حیرت اس وقت دور ہو جاتی ہے جب ہم اُردو پنجاب کے اثر و رشتہ کو تاریخ کی روشنی میں دیکھ کر ان نمونوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تاریخ شاید ہے کہ غیاث الدین تغلق (۷۲۰، ۷۲۵، ۱۳۲۵، ۱۲۳۰) اور خسرو خان نمک حرام کی جنگ کے حالات امیر خسرو نے غیاث الدین تغلق کو پنجاب کی زبان میں لکھ کر پیش کیے تھے۔ یہی وہ زبان ہے جو شروع ہی سے اُردو کے خون میں شامل ہے۔ "
(۲۹)

تاریخی اعتبار پنجاب ہندوستان کا سرحدی صوبہ ہے جس وجہ سے بیرونی حملہ آوروں کا پہلا پڑاؤ پنجاب ہی میں رہا۔ حملہ آوروں کے آنے اور آکر یہاں بس جانے کا سلسلہ ایک دو بار نہیں بل کہ صدیوں رہا ہے۔ بیرونی حملہ آوروں پر پنجابیوں نے اپنی تہذیب کے نقوش بھی چھوڑے اور ان کی تہذیبوں سے بھی بہت کچھ حاصل کیا۔ معاشرے میں جب تبدیلی رونما ہوتی ہے تو نئے الفاظ بھی وجود میں آتے ہیں اور پرانی زبانوں کے بہت سے لفظ خارج بھی ہو جاتے ہیں۔ محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ:

"اُردو دہلی کی قدیم نہیں بل کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اِس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔ "
(۳۰)

وہ مسلمان جو پنجاب میں داخل ہوئے اور جنگ و جدال سے الگ ہو کر اس دھرتی کو اپنا وطن بنایا؛ انہوں نے مقامی پنجابیوں کے دلوں میں گھر کر لیے۔ جب ان کا عوامی میل ملاپ بڑھا تو زبانوں اور معاشروں کے قریب آنے سے پنجاب میں ایک نئے معاشرے اور ایک نئی زبان کی تشکیل کا آغاز ہوا۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد تک زبانوں اور تہذیبوں کے جذب و قبول سے پنجاب گزرتا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ شروع سے یہاں مختلف اور مخلوط زبانیں بولی جاتی رہی ہیں۔ مختلف زبانوں اور بولیوں کے بولنے کا سلسلہ یہاں آج بھی جاری ہے پھر بھی پنجاب میں قومی زبان ہندی اور سرکاری زبان پنجابی ہے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آمد سے سکھ مذہب کے دس گروؤں کے دور تک اور پھر برطانوی حکومت سے تقسیم در تقسیم کے ادوار اور موجودہ عہد تک جب ہم پنجاب اور اُردو کے باہمی تعلق کا جائزہ لیتے ہیں تو اُردو کی ہر ترقی پسند تحریک کے روشن تانے بانے پنجاب ہی مربوط نظر آتا ہے۔ اُردو نے پنجاب کی تہذیب یہاں کے رسم و رواج، یہاں کے عوامی مزاج ان کی متنوع زندگی کی ترجمانی بھی کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں پنجاب کے اس جوہر نے ایک طرف تو خود کو پنجابی زبان میں اور دوسری طرف اُردو زبان میں منعکس کیا ہے۔ آزاد گلاوٹی کچھ اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ:

> ''سچ تو یہ ہے کہ پنجاب اپنی تمام تر ثقافتی توانائی اور برنائی کے ساتھ اُردو کی رگ رگ میں جاری و ساری ہے۔''(۳۱)

پنجاب میں اُردو کے ارتقا کے اس سفر کا ایک اہم موڑ پنجابی کے آفاقی شاعر سید وارث شاہؒ کا زمانہ ہے جو محمد شاہ رنگیلا سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک کا دور ہے۔ سید وارث شاہؒ پنجاب میں شیخوپورہ کے ایک تاریخی قصبہ جنڈیالہ شیر خان میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت ۵ ربیع الثانی ۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۸ء بتایا جاتا ہے۔ سید وارث شاہؒ نے خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے خاندان میں بیعت کی۔۔ وارث شاہ کو پنجابی زبان کا شیکسپیئر بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی تصنیف ہیر وارث شاہ کو پنجابی زبان میں ہی نہیں بل کہ عالمی ادب میں نمایاں شہرت اور منفرد حیثیت حاصل ہے۔ ہیر میں بہت سی کہاوتوں کا بھی استعمال کیا گیا ہے جو لوگوں کے لیے ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہیں۔ سید وارث شاہؒ کی ہیر کے علاوہ دوسری تصانیف میں معراج نامہ، نصیحت نامہ، چوہریڑی نامہ اور دوہڑے شامل ہیں۔ آپ نے ۱۰ محرم ۱۲۲۰ھ میں وفات پائی۔ سید وارث شاہؒ کا زمانہ سترھویں اور اٹھارہویں صدی کا زمانہ ہے جہاں ایک طرف پنجاب میں سید وارث شاہؒ کے ہاتھوں پنجابی پل بڑھ کر ایک خوب صورت اور پھل دار پودے کی حیثیت اختیار کر گئی۔ جب کہ دوسری طرف میر تقی میر نے اُردو زبان کی وہ خدمت کی کہ خدائے سخن کہلائے۔ سید وارث شاہؒ کا زمانہ پانے والوں میں پنجابی زبان کے شاعر بابا بلھے شاہؒ بھی شامل ہیں۔ جب کہ اسی عہد کے اُردو شعرا میں مرزا محمد رفیع سودا، سراج اورنگ آبادی، خواجہ میر درد، میر تقی میر، بہادر شاہ ظفر، نظیر اکبر آبادی، خواجہ حیدر علی آتش اور مرزا مظہر جانِ جاناں شامل ہیں۔ (۳۲)

ہیر وارث شاہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وارث شاہ صرف پنجابی کے شاعر نہیں ہیں انہوں نے ایسے الفاظ کا استعمال ہیر میں بھی کیا ہے جو اُردو زبان میں اس عہد کے شاعروں کے کلام میں موجود ہیں یوں ہمیں معلوم ہو گا کہ ایک طرف دبستان دہلی اور لکھنو کے نمائندہ شاعر اُردو کی خدمت کر رہے تھے تو دوسری طرف وارث شاہ نے بھی اُردو کو فروغ دیا۔ڈاکٹر جمیل جالبی اس بارے میں لکھتے ہیں کہ :

> ''وارث شاہ کی ہیر پنجابی زبان کی شاہ کار نظم ہے لیکن جہاں تک ذخیرہ الفاظ کا تعلق ہے اس میں ایسے الفاظ کثرت سے آئے ہیں جو اُردو اور پنجابی میں مشترک ہیں۔ پنڈت کیفی نے ایسے الفاظ کی ایک فہرست دی ہے.....الفاظ کے علاوہ ہیر میں بہت سے مصرعے ایسے بھی ملتے ہیں جو کم و بیش اُردو اور پنجابی میں مشترک ہیں۔ ''(۳۳)

یوں سید وارث شاہؒ کی ہیر کے مطالعہ سے جہاں دونوں زبانوں کے لسانی روابط کا پتہ چلتا ہے وہیں ان کی مشترکہ صوتیات بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

> ''ان مصرعوں میں اُردو کی آوازیں، اس کا لہجہ اس کے الفاظ پنجابی کے ساتھ گلے ملتے نظر آتے ہیں۔'' (۳۴)

پنجابی اُردو کے لسانی رشتے سید وارث شاہؒ کے ہاں بہت زیادہ ہیں ہیر میں مستعمل بہت سے الفاظ اُردو میں بھی مستعمل ہیں، پنڈٹ کیفی نے ایسے الفاظ کی طویل فہرست مرتب کر کے اس خیال کو تقویت دی ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے تحقیق سے مولوی محبوب عالم کی بیاض سے وارث شاہ کی ایک اُردو غزل ڈھونڈ نکالی ہے۔

حافظ محمود شیرانی اس غزل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ '' : حضرت وارث شاہ پنجابی کے بہترین شاعر مانے جاتے ہیں۔ میں مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار کی ایک بیاض سے ان کی ذیل کی غزل حوالہ قرطاس کرتا ہوں۔ '' (۳۵)

جس دن کو ساجن بچھڑے ہیں تس دن کا دل بیمار ہویا

اب کٹھن بنا کیا فکر کروں گھر بار سبھی بیمار ہویا

دن رات تمام آرام نہیں اب شام پڑی وہ شام نہیں

وہ ساقی صاحب جان نہیں اب پینا مے دشوار ہویا

بن جانی جان خراب بہی با آتش شوق کباب بہی

جوں ماہی بحر بے آب بہی نت رودن ساتھ بیمار ہویا

مجھے پی اپنے کو لیاؤرے یا مجھ سوں پی پہنچاؤرے

یہ اگن فراق بجھاؤرے سب تن من جل انگار ہویا

تب مجنوں کا میل ہویا تھا جب لیلیٰ کہہ کر رویا تھا

وہ یک دم سیج نہ سویا تھا اب لگ نیک شمار ہویا

سو میں اب مجنوں وار بہی پر دیش بدیس خوار بہی

اس پی اپنے کی یار بہی اب میرا بھی اعتبار ہویا

جب وارثؔ شاہ کہلایا نے تب روح سوں روح ملایا نے

تب سیج سہاگ سلایا نے جیو جان مخزن اسرار ہویا

اس غزل بارے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

"اِس غزل میں فراق و ہجر کی مضطرب کر دینے والی لَے نے ایک ایسا سوز پیدا کر دیا ہے کہ شعر دل میں اتر جاتا ہے۔ اس غزل سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وارث شاہ کو اُردو زبان پر بھی قدرت حاصل تھی اور وہ مٹھاس، نغمگی اور لوچ جو ہیر میں ملتے ہیں وہی ان کی غزل میں جاری و ساری ہے۔" (۳۶)

کلام سید وارث شاہؒ کے علاوہ پنجابی اور اُردو زبان میں مشترکہ الفاظ نہ صرف کثیر تعداد میں بل کہ قدیم ادب سے اب تک کے ادب میں پائے جاتے ہیں جو دونوں زبانی کے لسانی رشتوں کی گونج بن جاتے ہیں۔ اہم بات یہ کہ یہی لسانی اشتراک صوفیہ کے ہاں بہت زیادہ ملتا ہے۔ اس کی ایک وجہ صوفیہ کے افکار میں یک رنگی بھی ہے جس نے فکری یک رنگی کو لسانی یک رنگی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ماضی میں صوفیہ کے دوہوں میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کے نقش ہمیں اُردو میں بھی نظر آتے ہیں۔ بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے کئی دوہے اور ریختے ملتے ہیں: مثلاً

سائیں سیوت گل گئی ماس نرھیا دیہہ

تب لگ سائیں سیو ساں جب لگ ہو سوں کیہہ

راول دیول ہمے نہ جایئے

پھاٹا پہنہ روکھا کھایئے

ہم درو شنہ اہے ریت

پانی لوریں اور مسیت

علاوہ ازیں دیگر صوفیہ کرام کے دوہے اور ریختے جو خالص ہندوی میں ہیں، ان میں بھی ایسے الفاظ موجود ہیں جن کا ایک طرف لسانی رشتہ پنجابی سے قائم ہے تو دوسری طرف موضوعاتی اعتبار سے ان دوہوں کے مضامین اُردو نظم و نثر میں بھی ملتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مضامین کے اعتبار سے ان کا مشترکہ رنگ صوفیانہ ہی ہے۔ اس لیے دونوں زبانوں کی لفظیات کا ایک پہلو موضوعاتی اشتراک و یکسانیت بھی ہے۔ جیسا کہ بو علی شاہ قلندر پانی پتیؒ، شیخ شرف الدین یحیٰی منیریؒ، شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ جیسے صوفیہ کے ہاں ہے۔

انھی صوفیہ میں اٹھارہویں صدی کا ایک اہم نام خواجہ غلام فریدؒ کا بھی ہے۔ خواجہ غلام فریدؒ چاچڑاں شریف، پنجاب، پاکستان سے تعلق رکھنے والے مشہور صوفی شاعر ہیں۔ آپ کی شناخت شاعری کی صنف "کافی" ہے۔ آپ کا تعلق سلسلہ چشتیہ نظامیہ سے ہے اور آپ نسباً قریشی فاروقی ہیں۔ خواجہ غلام فریدؒ کی پیدائش بروز منگل ۲۵ ذیقعد ۱۲۶۱ھ مطابق ۲۵ نومبر ۱۸۴۵ء کو بہاول پور کے قصبہ چاچڑاں شریف میں ہوئی۔ آپ کے خاندان کا نسلی سلسلہ یا شجرہ نسب حضرت عمر فاروق سے جا ملتا ہے۔ آپ کے خاندان میں ایک شخص، جس کا نام شیخ کوربن، حضرت شیخ پڑیا تھا اس لیے کور کی وجہ سے لفظ کوریجہ بن گیا۔ آپ کا تاریخی نام خورشید عالم رکھا گیا۔ آپ کے والد کا نام خواجہ خدا بخش عرف محبوب الہی تھا۔ آپ نے قرآن کی تعلیم میاں صدر الدین اور میاں محمد بخش سے حاصل کی۔ آپ نے فارسی کی تعلیم میاں حافظ خواجہ جی اور میاں احمد یار خواجہ سے حاصل کی۔ خواجہ غلام فرید کے بزرگوں کے ایک مرید مٹھن خان جتوئی تھے، جن کے نام سے قصبہ کوٹ مٹھن آباد ہوا۔ جب کوٹ مٹھن پر قابض پنجاب کے سکھ حاکم مسلمانوں کو تنگ کرنے لگے تو آپ کے والد خواجہ خدا بخش اپنے خاندان کے ساتھ کوٹ مٹھن سے چاچڑاں

شریف، ریاست بہاول پور منتقل ہو گئے۔ اپنے بڑے بھائی خواجہ فخر جہاںؒ سے بیعت کی۔ ۴۷ برس ان کے انتقال پر آپ سجادہ نشین بنے۔ آپ کا وصال چاچڑاں شریف میں ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء بروز بدھ ہوا۔ آپ کا مزار کوٹ مٹھن (ضلع راجن پور) میں ہے۔ سلسلہ چشتیہ کے عام مسلک کے مطابق آپ کا نظریہ بھی "ہمہ اوست" تھا۔ یعنی آپ توحیدِ وجودی کے قائل تھے۔ آپ کا تمام کلام اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ انھیں ہر رنگ اور انگ میں اللہ کے حسن کے جلوے نظر آتے۔ شاعری میں حضرت خواجہ غلام فریدؒ نے سرائیکی کو ذریعہ اظہار بنایا اور شاعری کی صنف کافی میں کمال پیدا کر کے کافی کو شاعری میں مقام و مرتبہ اور دوام بخشا۔ خواجہ غلام فریدؒ کی سوز گداز مغمومیت نغمگیت اور سُر تال میں رندھی ہوئی کافیوں میں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی دونوں کے رنگ نمایاں ہیں۔ ہجر و وصال کے کٹھن اور طویل مرحلے سہنا' سینے میں وصالِ محبوب کی تڑپ، محبوب کی تلاش کے لیے جنگلوں اور بیابانوں میں سرگرداں رہنا؛ خواجہ غلام فریدؒ کی کافیوں میں ان تمام حالتوں کا ظہور نمایاں طور پر ہے۔ انہوں نے عشق کے دہکتے الاؤ میں اپنا آپ جھونک دیا۔ صحراؤں اور بیابانوں کی پاپیادہ خاک چھانی۔ ہجر و فراق کی لُو کے تھپیڑے سہے پھر بھی وصال یار کی خواہش نہ گئی اور یوں پُر سوز صدا بلند کی "میڈا عشق وی توں ایمان وی توں" اور اس سوز و گداز اور عشق کے امتحانوں میں بھی راحتِ قلب کا سامان ڈھونڈتے رہے۔

آپ کا کلام سرائیکی زبان میں ہے۔ جس کا نام دیوان فرید ہے جس میں ۱۷۲ کافیاں ہیں۔ لطیف احساسات، جذبات اور اس میں وجدانی کیفیات کو اس طرح ملا کر کہ شیر و شکر ہو جائیں، آپ نے کافی کی صنف میں باکمال شاعری کی ہے۔ اپنے پیغام کی مناسبت اور عصری تقاضوں کو ملحوظِ خاطر لاتے ہوئے اپنے عہد کی اہم زبانوں اُردو، عربی، فارسی، پوربی، سندھی اور ہندی میں شاعری کی اور اپنے پیغام کو اپنی محبت کی بدولت بامِ عروج تک پہنچایا۔

سرائیکی میں دیوانِ فرید کے علاوہ اُردو میں خواجہ غلام فرید کا کلام دیوان کی صورت میں چھپ چکا ہے۔ مختلف محققین کی آراء اور دیگر حوالہ جات کے مطابق خواجہ غلام فرید کا اُردو کلام ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۴ء تک اشاعت کے مراحل سے گزرتا رہا۔ ڈاکٹر شکیل پتافی کے مطابق ۱۹۷۲ء صدیق طاہر نے اُن کا اُردو کلام شائع کیا جس میں ۹۸ غزلیں، ۹ رباعیات، ۲ قطعات اور ایک سرائیکی اُردو مخلوط نظم تھی۔ صدیق طاہر کا مرتب کردہ یہ اُردو دیوان ۱۸۸۴ء میں مطبع رونق آگیں' گلزارِ محمدی' لاہور سے شائع شدہ دیوان کے مطابق ہے۔ اُس دیوان میں بھی ۲ قطعات ۴ رباعیات ایک مخلوط نظم اور ۹۸ اُردو غزلیں ہیں۔ حضرت خواجہ غلام فریدؒ سرائیکی کے ساتھ ساتھ

فارسی، عربی، سندھی، ہندی، اُردو اور انگریزی وغیرہ سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ چناں چہ سرائیکی کلام کے ساتھ ساتھ اُن کے یہاں اُردو کلام بھی ملتا ہے۔ سندھی اشعار اور ہندی گیت کے نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔ خواجہ غلام فرید کا اُردو کلام انتہائی اہمیت کا حامل اور توجہ طلب ہے۔ ان کی غزلوں میں تخیل کی بلندی اور فکر کی گہرائی اور وسعتِ معنویت کے ساتھ ساتھ عشق محبت اور اس کے متعلقاتِ تصور، تصوف اور اس کے حاصل مجاز، حقیقت کا امتزاج اور زندگی کے تمام متنوع تجربات ان کی اُردو شاعری میں موجود ہیں۔ خواجہ غلام فریدؒ عشق کے پہلوؤں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی دونوں کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ وحدت الوجود کے فلسفے کے اظہار کے لیے ان کا فطری مظاہر سے والہانہ لگاؤ اور عشقِ مجازی میں عشقِ حقیقی کے جلوے ان کے عرفان کے مظہر ہیں۔

امیر خسروؒ سے لے کر خواجہ غلام فریدؒ تک لسانیات ہو یا قواعد، موضوعات ہوں یا اصناف مجوعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کی تخلیقی فضا کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے جس میں لکھنو اور دلی سے منفرد احساس، اپنی خوش بو اور الگ پہچان ہے جو کہ قدیم تخلیقی ادب سے اب تک کے تخلیقی ادب میں موجود ہے۔

اس بارے ڈاکٹر علی محمد خان لکھتے ہیں

> ''ہر خطہ ایک منفرد مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ جیسے دلی کی فطرت، سادگی اور متانت لکھنو کا معاشرتی احساس، نزاکت و لطافت بعینہ اس خطۂ پنجاب میں تشکیل پانے والے دبستان خیال اسلوب کی توانائی سے مالا مال نظر آتا ہے اور اس جدت کو قبول کرنے کی صلاحیت اسے دیگر دبستانوں پر مزید تقویت عطا کرتی ہے۔''(۳۷)

اس سارے عہد میں پنجاب کی ادبی خدمات سے انکار ممکن نہیں لیکن انیسویں صدی کے آخر میں پنجاب کی ادبی خدمات پر مختلف حلقوں میں مختلف بحثوں نے جنم لیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول:

> ''انیسویں صدی کے اواخر میں یہی اُردو زبان و ادب کے سلسلہ میں پنجاب کی اہمیت اور خدمات کو جتلانے اور جھٹلانے کا قصہ شروع ہو چکا تھا۔ اگر لسانی نقطہ نظر سے پنجاب کا جائزہ نہ بھی لیں تو ادبی لحاظ سے پنجاب کی خدمات سے انکار ناممکن ہے کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو کی ترویج اور ادب کی اشاعت کا سب سے اہم مرکز پنجاب کا دل لاہور قرار پایا تھا۔''(۳۸)

پنجاب کی ادبی تاریخ کھنگالیے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ محمود غزنوی سے لے کر انگریز حکمرانوں تک سبھی نے اپنے طور پر ادبی و ثقافتی روایات قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ انگریز حکومت نے جدید علوم و فنون کو رواج دیا۔ نصاب سازی کے حوالے سے بھی پنجاب کی اردو خدمات نمایاں نظر آتی ہیں۔ اُردو زبان پنجاب میں اس قدر مقبول رہی ہے کہ خود اہل پنجاب نے اس زبان میں نصاب تیار کیا تھا۔

پنجاب میں اُردو نصابوں کا رواج اور تصنیف و تالیف سے یہ نظریہ جڑ پکڑتا ہے کہ اُردو زبان اس صوبے میں قدیم دور سے ذریعہ تعلیم رہی ہے۔ ایک طرف علما اور امراء کے ذاتی حجرے لوگوں کو علم کے زیور سے آراستہ کر رہے تھے۔ چھوٹے بڑے ہر شہر اور قصبے میں اپنی مدد آپ کے تحت علم کی شمعیں روشن تھیں۔ جن کی شعاعیں برصغیر کی فضا کو بعقۂ نور بنا رہی تھیں۔ صاحبِ استطاعت اور اہل ثروت کے ہاں ذاتی کتب خانے بھی قائم تھے جن کے دروازے تشنگان علم و ادب کی پیاس بجھانے کا کام دیتے تھے۔ مولوی نور احمد چشتی کی ''یادگار چشتی'' اس دور کی بہترین اُردو نثر اور پنجاب کی تہذیبی زندگی کی ایک نایاب دستاویز ہے، مولوی احمد بخش یک دل، فقیر سید نورالدین منور، فقیر سید عزیز الدین آزاد، راجا دینا ناتھ سوز، عبدالرحمان خلدی، احمد یار مرالوی، اشرف نوشاہی کے نام بھی اسی عہد کی اُردو نثر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جب کہ شعر و ادب کی آبیاری میں مولوی نور احمد چشتی مصنف یادگار چشتی، تحقیقات چشتی، اور مولوی محرم علی چشتی ایڈیٹر "رفیقِ ہند" کے نام قابل ذکر ہیں۔

اُردو زبان کے ادبی و علمی کارناموں اور نظم و نثر کی تخلیق کے اعتبار سے انیسویں صدی ایک بڑی صدی ہے۔ بدلتے ہوئے سیاسی منظر میں اب اُردو نے فارسی کی جگہ لے لی تھی۔ لغات اور اُردو قواعد کے سلسلے میں عیسائی مبلغین نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ انیسویں صدی تخلیقی اعتبار سے ادب، زبان اور شاعری کی سب سے اہم صدی ہے۔ اس صدی میں اُردو زبان و ادب کے متعدد ادیب اور شاعر دادِ تخلیق پا رہے تھے۔ انیسویں صدی اور اس کے ادب کے پس پردہ پنجاب کی سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی و فکری صورت حال بھی شامل رہی ہے جس کی ترویج اور فروغ میں مسلمان فاتحین سے زیادہ مسلمان صوفیہ کا کردار نمایاں ہے، جس میں ترک، افغان ایرانی اور دیگر مسلمان اقوام نے پنجاب کو اپنا مسکن بنایا اور کثیر تعداد میں صوفیہ یہاں وارد اور قیام پذیر ہوئے اور اس اختلاط سے بتدریج ایک نئے متصوفانہ تمدن نے جنم لیا۔ اس نئے تمدن کا ابتدائی مرکز لاہور تھا۔ جہاں اُردو شاعری کے مزاج کو بدلنے میں انجمن پنجاب نے اہم کردار ادا کیا، انجمن پنجاب کے مشاعروں میں صوفی فکر کی نمائندگی اقبال نے کی۔ انیسویں صدی میں پنجاب کی سرزمینِ اُردو کے گلستان میں وہ پھول کھلے۔ جن کی مہک سے آج بھی اُردو

ادب خوش گوار اور زندہ و جاوید ہے۔ اس حوالے سے حافظ محمود شیرانی پنجاب میں اُردو کے ارتقا اور آغاز کا نظریہ پیش کر چکے ہیں۔ دوسری جانب صوفیائے پنجاب کے حوالے سے بھی اہم روایت موجود ہے کہ اُردو کے فروغ میں صوفیا نے سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ جن سے انیسویں صدی کے شعر و ادب کی روایت نے جنم لیا۔

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب کا متصوفانہ لسانی ماضی بڑا تابناک ہے۔ اس کی منفرد آب و ہوا میں اعلا پائے کے ذہین صوفی منش لوگ پیدا ہوئے۔ اس کے قدرتی آب پاشی کے اعلا نظام کی بدولت یہاں کی زمین نہایت زرخیز پیداوار کے لحاظ سے منفرد رہی۔ یہی اسباب تھے کہ یہاں دنیا کا عمدہ ترین تمدن وجود میں آیا اور اسی آمیزش سے ایک سدا بہار تہذیب پیش رہی۔ ایسی مختلف اقوام کے ملاپ سے یہاں پر اعلا تہذیبی اور ثقافتی روایات قائم ہوئیں اور ایسی کئی نابغہ رُوزگار شخصیات پیدا ہوئیں جنھوں نے صوفیانہ فکر میں تابناک علمی کارنامے سر انجام دیئے۔ اس طرح پنجاب کی تہذیب کے بعض پہلو دنیا کی دوسری معاصرانہ تہذیبوں سے کئی لحاظ سے بہتر اور برتر ہو گئے۔

حوالہ جات

۱۔ اقبال صلاح الدین، تاریخ پنجاب (لاہور: عزیز پبلشرز، ۱۹۸۸ء)، ص ۱۹

۲۔ ڈاکٹر ناشر نقوی، اُردو پنجاب اور سکھ شعراء (پٹیالہ: پنجابی یونیورسٹی، ۱۹۹۹ء)، ص ۲۷

۳۔ آئن ٹالبوٹ، تاریخ پنجاب، مترجم: پروفیسر طاہر کامران (لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۶ء)، ص ۲۳

۴۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر: پنجاب میں اُردو صحافت کی تاریخ (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز: ۱۹۹۶ء)، ص ۱۵

۵۔ ایضاً، ص ۱۸۔۱۹

۶۔ حمید اللہ ہاشمی، پاکستانی زبانیں: پنجابی، پہاڑی، گوجری (اسلام آباد علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء)، ص ۷

۷۔ ایضاً، ص ۱۲

۸۔ اقبال صلاح الدین، تاریخ پنجاب (لاہور: عزیز پبلشرز، ۱۹۸۸ء)، ص ۱۵

۹۔ محمود شیرانی: حافظ، پنجاب میں اُردو (لکھنؤ، نسیم بک ڈپو؛ لاٹوس روڈ، ۱۹۸۱ء)، ص ۹۹

۱۰۔ جمیل جالبی؛ ڈاکٹر، تاریخ اُردو ادب (لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۷۵ء) ج: ۱، ص ۴۷

۱۱۔ گیانی عباد اللہ، گورو گرنتھ صاب اور اُردو (لاہور، مرکزی اُردو بورڈ ۱۹۶۶ء)، ص ۷۲

۱۲۔ الف دنسیم: اُردو قدیم اور چشتی صوفیا (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان: ۱۹۹۷ء)، ص ۹

۱۳۔ تبسم صوفی، پاکستان میں اُردو؛ چوتھی جلد پنجاب (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء)، ص ۶۱

۱۴۔ محمود شیرانی حافظ، پنجاب میں اُردو (لکھنو: نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۱ء)، ص ۲۴

۱۵۔ مجیب رضوی، خسرو نامہ (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۷ء)، ص ۳۹

۱۶۔ محمود شیرانی حافظ، پنجاب میں اُردو (لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۱ء)، ص ۹۹

۱۷۔ نظیر احمد، ڈاکٹر، امیر خسرو کے ادبی و شعری کمالات پر ایک نظر، ہندوستانی زبان؛ خسرو نمبر (بمبئی، ۱۹۷۲ء) ص ۷۹

۱۸۔ شمس القادری، اُردو قدیم (لکھنو، ۱۹۲۹ء)، ص ۳۰

۱۹۔ گوپی چند نارنگ، 'امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ برلن ذخیرہ اشپرنگر، طبع سوم (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۰۸

۲۰۔ جمیل جالبی ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو؛ جلد اول (دہلی: ایجوکیشنل پبشنگ ہاؤس ۲۰۱۳ء)، ص ۲۹

۲۱۔ شبلی نعمانی، شعر العجم؛ جلد دوم (اعظم گڑھ یوپی: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۱۹، ۱۱۸

۲۲۔ محمود شیرانی؛ حافظ، پنجاب میں اُردو، ص ۲۵

۲۳۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو (کراچی: غضنفر اکیڈمی، ۲۰۰۳ء)، ص ۴۰۲

۲۴۔ پروفیسر فتح محمد ملک، مرتب، پاکستان میں اُردو، جلد چہارم (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء) ص ۱۲

۲۵۔ ایضا، ص ۱۳

۲۶۔ خورشید احمد خان یوسفی، پنجاب کے قدیم شعرا (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء)، ص ۵ تا ۸

۲۷۔ عطش درانی، پنجاب میں اُردو اور دفتری زبان (لاہور: نذیر سنز پبلشرز، ۱۹۸۹ء)، ص ۳۶

۲۸۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اوّل (لاہور: مجلس ترقی اُردو ادب، ۱۹۷۵ء)، ص ۵۹۲

۲۹۔ ایضا، ص ۲۲، ۲۳

۳۰۔ محمود شیرانی، پنجاب میں اُردو، ص، ۱۹

۳۱۔ آزاد گلاٹی، اذکار (سہارنپور: طالب پریس، ۱۹۷۸)، ص۔ ۵۴

۳۲۔ طاہرہ رباب، کانگاں، وارث شاہ نمبر، شمارہ اپریل تا جون (۲۰۱۱)، ص ۶۲۲

۳۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخِ اُردو ادب، جلد دوم (لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۸۴ء)، ص ۶۵۷

۳۴۔ ایضاً ص ۶۵۸

۳۵۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اُردو، ص ۳۱۸

۳۶۔ جمیل جالبی؛ ڈاکٹر، تاریخِ اُردو ادب (لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۸۴ء) ج: ۲، ص ۶۵۹

۳۷۔ علی محمد خان، ڈاکٹر: لاہور کا دبستان شاعری (لاہور: نشریات، ۲۰۰۸ء)، ص ۹

۳۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۳)، ص ۷۰